نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتعا لک نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر راضی ہو گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی۔ اور کیوں نہ ہو، اول تو خواندہ، دوسرے اعلیٰ درجے کی رنڈیوں میں پرورش پائی، شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی، محلات شاہی تک اس کی رسائی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہو گا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں، میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت ہی بگڑیں مگر اب کیا ہوتا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جا بہ جا جو کچھ رہ گیا تھا اسے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب۔۔۔ صاحب سے ملاقات تھی۔ انہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا، مجھے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، مگر یہ میری ذاتی رائے ہے، ناظرین کو اختیار ہے، جو چاہیں قیاس کر لیں۔

مرزا رسوا

لکھنؤ، مارچ 1899ء

حصہ اول

(1)

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنیئے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگ خاندان، عار دو جہان کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنیئے اور اچھی طرح سنیئے:

باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، نائی، دھوبی، کمہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے دوڑا، دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھالیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے "ابا، اللہ! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو! میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے، تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔" جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشار کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے، نماز پڑھی، اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی، پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

"میرے ابا! آج نہ بھولنا، گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔"

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے، ایک، دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیوں کہ ابا پہر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پرونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی، یا دروازے پر املی کا درخت تھا، وہاں چلی گئی۔ ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے، بھیا کو بٹھا دیا، خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے! کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیوں کہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا، نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی، وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کھٹریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ دالان کے سامنے باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کھپریل، دو کوٹھریاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے

گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا، محلے کی عورتیں خود ہی کنویں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے، تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں، ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا، مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بچپنے کے بھولے بھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ سوتواں نہ تھی، مگر چپٹی اور پہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا، اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائے جامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا، ٹول کا نینہ، نینو کی کرتی، تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا، مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی، اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں نوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں تو میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی، اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ! میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر

کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنتا ہے۔ میرا دولہا عید کے دن کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا، گلبدن کا پائجامہ، مصالے کی ٹوپی، مخملی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پمیٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی، کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی، مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو، مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چنداڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا۔ موا چاندی کا تار تھا، شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی، قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے میں اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی، ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انہوں نے مجھے پچکارا، اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی، اماں ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی، مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے اسے گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگالیا، گود میں اٹھالیا، پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھرکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا، مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہوگئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے ٹوٹکے منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا سب گہنا تار کے ابا کے حوالے کیا کہ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو جلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے، باقی نکال کے علیحدہ کر دیے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا "اوہ جی ہوگا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہے، وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے

لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں، سسرال کا نام برا ہوتا ہے، میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔"

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوش وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے، کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں، بہن جس کو دیکھتی ہیں، اسی حالت میں ہے، مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں، اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی، اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کم بخت، ادماتی تھی، شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی، نکل کھڑی ہوئیں۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جہاں سوائے گم راہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں، جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا، مواڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد میں یہ گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ ابا بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گرائی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "دل جمعدار! تم

سچ سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا ایک کبوتر اڑا لیا۔ لینے گئے، نہ دیا۔ چار آنے دیتے تھے، وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے، جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی، دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے، کبوتر لے لو۔" میں اس کے دام میں آ گئی، ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں، گھر میں کانی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دی۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا، مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا، وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا۔ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا، کوئی بس نہیں۔ موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہلی کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، دم نکلا جاتا تھا۔

آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا تھا ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا، مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں:۔ دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا۔۔۔ تلملاتا پھرتا ہو گا۔

پیر بخش:۔ بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں

تیر ہوئے؟

دلاور خاں:۔ پورے بارہ برس ہوئے بھائی! لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں، خیر۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کو تو کوئی دن کو یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا، میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش:۔ کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں:۔ تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش:۔ بھئی تم قول کے سچے ہو، جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خاں:۔ دیکھنا!

پیر بخش:۔ اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں:۔ کریں گے کیا، یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے، دل میں ایک دھچکا سا پہنچا، منکا ڈھل گیا، ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کر بھی موئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش:۔ اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں:۔ گلے گلے پانی۔

پیر بخش:۔ کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلاور خاں:۔ گھر تو چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کر دے دوں گا۔

پیر بخش:۔ تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں؟

دلاور خاں:۔ کہو۔

پیر بخش:۔ اماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھوکری کے کوڑے کرو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا، مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی یہ بات سن کے میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں:۔ اچھا دیکھا جائے گا، ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش:۔ یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں؟ وہ درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے، تھوڑی آگ لے آئیں

تو حقہ بھر لیں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اک بارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرام زادی! چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا۔ فیل کرتی ہے۔۔۔۔"

پیر بخش:۔ (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہو گا) نہیں بھئی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا، تمہیں ہمارے سر کی قسم! اماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں:۔ اچھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں:۔ (ایک کش حقے کا پی کر) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش:۔ اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں! پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں:۔ کریم؟

پیر بخش:۔ ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا، لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں:۔ آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش:۔ کہاں ہے؟ لکھنؤ میں ہو گا۔ گومتی اس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہو گا۔

دلاور خاں:۔ بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش:۔ جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش:۔ سو ڈیڑھ سو، جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھائی کی باتیں! سو ڈیڑھ سو! اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی ملیں تو بہت ہے۔

پیر بخش:۔ اچھا اس سے کیا ہے، لے تو چلو، مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر

بخش نے جواب دیا: "وہ تو ہم سمجھے ہی تھے، تم کیا ایسے بے وقوف ہو۔"

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ رقت سلب ہو گئی تھی، بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کمبل سرکا کے جو دیکھا، معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا، سامنے کچھ کچے کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسا کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار لاڈ کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے مجھ کو دیے۔ رات بھر کی بھوکی تھی، کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا، پھر چپکی ہو کے پڑی رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے، دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا، گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی پھرنی نکلی، نہ مجھ پر گھونسے پڑے، نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے، باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے، کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے، دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے، سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی، آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی سے کود پڑتا ہے، دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے، بات رفت گزشت ہوئی، ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک:۔ ہمارے تمہارے لڑائی ہی کیا! بات کی بات تھی۔

دوسرا:۔ بات ہی کیا تھی؟

پہلا:۔ اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا:۔ جانے دو۔

(2)

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی! مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے ! دنیا میں تو خیر تو اپنی سزا کو پہنچا، مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی؟ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کووں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے، اور قیامت کے دن چاہے گا تو اس سے بدتر درجہ ہو گا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہو گا! کیسے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں۔۔۔۔۔

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبانہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اس کو بھی ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے، ماشاء اللہ چودہ پندرہ برس کا، دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی، فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا رستہ تھا، مگر دلاور خاں اس خوف سے، کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے، نہ معلوم کن بیہڑ راستوں سے لایا کہ کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے، مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لیے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا نام گھر میں سنا کرتی تھی، کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان اور کریم کی ساس موئی مردے شوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے

لکھنؤ پہنچی تھی، دو پہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچہ بھر ماش کی دال اور پانی کی ایک بدھنی میرے آگے رکھ کر چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چبینے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا، کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی، پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس، ڈائن کی شکل بکتی جھکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ گئی۔

"لونڈیا کتنا سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے اٹھایا، سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ پھر اٹھ بیٹھی۔"

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک جھک چکی تو پوچھنے لگی "پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی، اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے، تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی، اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی چھکو پھکو روتی رہتی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔ کسی بنیے کی لڑکی تھی، رام دئی نام تھا۔ سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا، وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا، میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری، بہت خوب صورت ناک نقشہ، ڈیل ذرا چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خان اور پیر بخش نے آ کے مجھے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان سا ملا، پھر ایک بازار میں سے ہو کے گزرے۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپتی جاتی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد

ایک بازار پھر ملا، اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا، پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی بھیڑیں تھیں۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچے۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی، یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی، جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا، یعنی خانم جان کا مکان۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینے پر سے چڑھ کر اوپر گئی۔ مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے دہنی طرف ایک وسیع کمرے میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شان دار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا، مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں، مگر ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے مشروع کا پائے جامہ، بڑے بڑے پائنچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دو دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انہی کا سا تھا، مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں، کنول روشن ہے۔ بڑا سا نقشی پان دان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پنچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی بسم اللہ جان ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

"خانم جان:۔ یہی چھوکری ہے؟

دلاور خان:۔ جی ہاں!

مجھے پاس بلایا، چمکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم:۔ اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے، اور دوسری چھوکری کیا ہوئی؟

پیر بخش:۔ اس کا تو معاملہ ہو گیا۔

خانم:۔ کتنے پر؟

پیر بخش:۔ دو سو پر۔

خانم:۔ اچھا خیر، کہاں ہوا؟

پیر بخش:۔ ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحب زادے کے واسطے مول لیا ہے۔

خانم:۔ صورت شکل کی اچھی ہے، اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش:۔ میں کیا کروں، میں نے بہت سمجھایا، میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خان:۔ صورت تو اس کی بھی اچھی ہے، آگے آپ کی پسند۔

خانم:۔ خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خان:۔ اچھا، جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔

خانم:۔ اچھا، تمہاری ہی ضد سہی۔

یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔

خانم:۔ حسینی!

حسینی:۔ خانم صاحب!

خانم:۔ صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی، صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خان کے سامنے رکھ دیے (بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے تھے)۔ ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے۔ (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردوے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں، بوا حسینی ہیں اور میں ہوں۔

خانم:۔ (حسینی سے) حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟

حسینی:۔ مہنگی! میں کہتی ہوں سستی۔

خانم:۔ سستی بھی نہیں ہے، خیر ہو گا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہو گا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا! آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی:۔ خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں! بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں؟

خانم:۔ سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے، سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا، سینخوں سے داغ داغ کے مار ڈالا۔

حسینی:۔ دنیا میں جو چاہیں کر لیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہو گا۔

خانم جان:۔ منہ کالا ہو گا! جہنم کے کندے پڑیں گے۔

حسینی:۔ خوب ہو گا، موئیوں کی یہی سزا ہے۔

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

"بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجیے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے، خدمت میں کروں گی۔"

خانم:۔ تمھی پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں، اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں، مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی:۔ بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟

میں:۔ (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی:۔ (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم:۔ اے ہے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔

حسینی:۔ (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں:۔ جمعدار۔

خانم:۔ تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے، ابھی بچہ ہے۔

حسینی:۔ اچھا تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔ امیرن۔

خانم:۔ بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں، ہم تو امراؤ کہہ کر پکاریں گے۔

حسینی:۔ سنا بچی! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی "امراؤ" "تم کہنا "جی"۔

اس دن سے امراؤ میرا نام ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی، لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔ خانم صاحب مرتے دم تک "امراؤ" کہا کیں۔ بوا حسینی "امراؤ صاحب" کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں۔ منہ ہاتھ دھلایا، اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں، مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے، چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کر دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں،

جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں، اماں باورچی خانے میں ہیں اتنے میں جوابا کو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔ خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے ہشیار کیا۔ آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتی ہوں، نہ وہ گھر ہے، نہ دالان، ابا ہیں، نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا، میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے بھی آنسو برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ اور بھولتی نہ تو کرتی کیا! اول تو مجبوری، دوسرے نئے ڈھنگ، نئے رنگ۔ اچھا سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی میں آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے، تماشے، میلے، باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت ہی جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا، مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں تیر کرنا ہے۔

جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں، بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں ان موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی، اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف 40 کوس ہے، مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔

(3)

اک حال میں انساں کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہو گا، کس قدر وسیع تھا، کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی

ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی، تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے، وہ اور رنڈیوں کو عید بقر عید میں نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان کیا تھا، ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو، سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔ اگرچہ میں کم سن تھی، مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے، اپنے مطلب کی سب سمجھتی تھی۔

بسم اللہ اور خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بہ خود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصے میں میری تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن موسیقی کے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے استائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سربیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کومل سے ات کومل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیور تر ہو جائے۔ اور میری بھی جتیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی، دھیوت سدھ لگا گئی۔ استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم:۔ بھلا استاد جی، یہ کیا تھا؟ رام کلی میں او چار دھیوت سے ہے اور وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا سدھ؟

استاد:۔ کومل۔

خانم:۔ اور چھوکری نے کیا کہا تھا؟

استاد:۔ سدھ۔

خانم:۔ پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟

استاد:۔ کچھ مجھے خیال نہ رہا۔

خانم:۔ واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں؟ ابھی کسی سمجھ دار کے

سامنے اس طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے، چپ ہو رہے، مگر دل میں بات لیے رہے۔ استاد جی اپنے کو نائک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی ہوں، خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا "گندھار اس میں کومل ہے یا ات کومل؟"

استاد جی:۔ ات کومل۔

خانم:۔ خان صاحب! ماشاءاللہ! یہ میرے سامنے!

استاد جی:۔ کیوں؟

خانم:۔ اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں "کیوں؟" سوہا میں گندھار ات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔

استاد جی:۔ گندھار کومل کو ات کومل لگا گئے۔

خانم:۔ بس آپ ہی قائل ہو جیے۔ خود آپ 'کومل' کہیں اور چھوکری کو 'ات کومل'۔ یا تو آپ چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کہتے ہیں۔ خان صاحب! میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے چاہے نہ ادا ہو، مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا؟ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے، نہیں تو معاف کیجیے۔ میں کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔ چھوکریوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد جی:۔ بہت خوب!

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے، قسما قسمی ہو کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو استاد نہ سمجھتے تھے۔ مجھے عمر بھر حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی، کیوں کہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں، استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے یا جان بوجھ کے نہ بتاتے تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی، مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا یا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی

تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی، مگر پہ ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا، اس پر بھی لے سے ہانون رہیں۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی، گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ ان کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سید ھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں، مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا توا، اس پر چیچک کے داغ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے۔ لال لال آنکھیں، بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹ، بڑے بڑے دانت، فربہ انتہا سے زیادہ، اس پر ٹھنگنا قد۔ بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کہتے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھیں۔ مور چھنا ان ہی کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی، مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی۔

میں:۔ باجی! ہاں ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا:۔ سنو:۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔

میں:۔ میں یہ نہیں مانتی، سرتیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔

بیگا:۔ لڑکی! تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے کیوں نہیں پوچھتی؟

میں:۔ اللہ! باجی تمھی بتا دو۔

بیگا:۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی دیکھ بائیس ہوئیں؟

میں:۔ (شرارت سے) اوئی، میں نے نہیں گنیں، پھر کہو۔

بیگا:۔ جا اب نہیں کہتی۔

میں:۔ واہ! میں تو کہوا کر چھوڑوں گی۔

بیگا:۔ پھر وہی! کہہ دیا، لے اب نہ ستا۔

میں:۔ ہاں اب کی گنیں، 'نی' میں دو ہیں نا؟

بیگا:۔ ہاں دو۔

میں:۔ تو ٹھیک بائیس ہوئیں۔ اب تینوں گرام کہہ دو۔

بیگا:۔ لے اب ٹہلیئے، کل آئیے گا۔

میں:۔ اچھا تنبورہ اٹھا لاؤں، کچھ گاؤ۔

بیگا:۔ کیا گاؤں؟

kitaabiyat.pk

میں:۔ دھنا سری۔

بیگا:۔ کیا گاؤں؟ استائی، دھرپد، ترانہ؟

میں:۔ اللہ! باجی دھرپد گاؤ۔

بیگا:۔ لے سن۔

"تن کی تپ، تب ہی مٹے جب پیارے کو درشٹ بھر دیکھوں گی۔
جب درشن پاؤں گی ان کا تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی!۔
اشٹ جام دھیان موہے وا کو رہت ہے رے نا جانوں کب درشن ٹھیوں گی
جو کو ہو پربھو پیارے سے ملا دے وا کے پائن میں سیس ٹیکوں گی

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی، ہروتی کی جریب، چاندی کی شام، بہت ہی نفیس ڈیڑھ خمہ حقہ، افیون کی ڈبیا، پیالی، غرضیکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا! وضع دار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا، آج تک اسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر خدا کے دیے گاؤں گراؤں، مکان بیوی، جوان لڑکے لڑکیاں، سب کچھ موجود تھا، مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے، یہیں کے ہو رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ روپیہ بھی آیا کرتا تھا۔ دس روپے خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے، حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویل دار بھی بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں، بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمے لی تھی، اس لیے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے، پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندہ ناتراش کو انہوں نے آدمی بنا دیا۔ یہ ان ہی کی